لامذہبی دور کا علمی و تاریخی پس منظر

جناب محمد تقی صاحب امینی صدر دارالعلوم وصدر دینی تعلیمی کانفرنس راجستھان۔

(۴)

مذہب وحی پر مذہب فطرت کے غلبہ پانے کا سیاسی انداز

مذہب فطرت نے مذہب وحی پر غلبہ حاصل کرنے میں سیاسی انداز اختیار کیا تھا جس کی صورت یہ تھی کہ ابتدا میں اس نے ہر شئے کو عقلی معیار پر جانچنے کی تبلیغ کی اور جو شئے اس معیار کے مطابق نہ ہو اس کو "وحی" سمجھنے سے انکار کر دیا۔

اس مرحلہ میں یقین تھا کہ جو کچھ صحیفوں میں لکھا ہوا ہے وہ عقل کے بالکل مطابق ہے اس لئے مخالفت زیادہ نمایاں نہ ہو سکی۔ اگرچہ عقل کے غلبہ سے ایمان و وجدان کی کیفیت کو زبردست نقصان پہونچا اور "کلیسا" دورِ جدید کے اچھے پہلوؤں کے ساتھ بڑی حد تک بڑے پہلوؤں کا بھی حامی بن گیا۔

پھر چونکہ معجزات اور نفس "وحی" پر بحث وتمحیص کا سلسلہ شروع ہوا کہ :-

"چونکہ معجزات سے خدائی کام میں خلل پڑتا ہے اس لئے خدا اپنے کام میں معجزوں سے خلل انداز نہیں ہو سکتا ہے۔

"اور نہ وہ یہ کر سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو براہ راست "وحی" بھیجے اور دوسروں کو اس سے محروم رکھے یہاں تک کہ بعض لوگ اس سے واقف بھی نہ ہو سکیں"

اس کے بعد درج ذیل خیال کی اشاعت عام ہو گئی۔

"چونکہ فطری مذہب اکتفا کرتا ہے اس لئے "وحی" کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نیز طبعی و اخلاقی دونوں حیثیتوں سے "وحی" ناممکن ہے" [1]

---

[1] تاریخ فلسفہ جدید جلد دوم ص ۸ و ۱۲

مذہب اور زندگی کے بنیادی امور میں عقل دخل انداز نہیں ہو سکتی

مذہب فطرت والوں نے بالواسطہ اور آزاد خیال لوگوں نے بلاواسطہ مذہب اور زندگی کے حالات میں تصفیہ کے لیے "عقل" کو معیار تسلیم کیا ہے۔ ذیل میں قدرے وضاحت کی جاتی ہے کہ ان دونوں کے اہم معاملات میں کیا واقعی "عقل" معیار بن سکتی ہے؟

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حقائق و اشیاء کے ثابت کرنے کے لیے عقل نہایت مفید و موثر ذریعہ ہے لیکن تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ مذہب اور زندگی میں اس کی دخل اندازی کی ایک حد مقرر ہے اس حد سے باہر دخل دینے کی یا تو اس میں ہمت نہیں ہے اور یا اس کی مداخلت بے سود اور بسا اوقات ضرر رساں ثابت ہوتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے اکثر و بیشتر لمحات میں عقل بے بس ہے یہ لمحات محض جذبات و مرغوبات کی تاریکیوں میں طے ہوتے ہیں وہاں نہ عقل کی رہنمائی ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو اس سے کوئی خاص نتیجہ نہیں برآمد ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کیسے باور کر لیا جائے کہ جو شے انسان کی عقل و فہم سے خارج ہو وہ اس کی زندگی سے بھی خارج ہو۔

اسی طرح مذہب کے بنیادی امور عقلی حدود سے ماورئی ہیں عقل کی پرواز کا جو انتہائی مقام ہے مذہب کا وہ نقطۂ آغاز ہے اور مذہب کی جہاں سے ابتدا ہوتی ہے عقل کی رسائی وہاں ختم ہو جاتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ عقلی مباحث کا تعلق بڑی حد تک فطرت و کائنات فطرت کے واقعات و مشاہدات اور تجربات سے ہے۔ لیکن حقیقی مذہب کی بنیاد کا تمام تر تعلق فوق الفطرت ہستی یا ان چیزوں سے ہے جو انسانی عقل و تجربہ کی دسترس سے ماورئی ہیں۔

ایسی صورت میں عقل کو مذہب و حی کا تجزیہ کر کے اس کے بنیادی امور کی تردید کا کیونکر حق پہونچ سکتا ہے؟ اور وہ تردید کیسے قابلِ قبول بن سکتی ہے؟

عقل کی زود اثری اور متلون مزاجی کے چند نمونے

پھر عقل اس قدر زود اثر اور متلون مزاج واقع ہوئی ہے کہ ہر دور و ہر زمانہ میں وہ بدلتی رہتی ہے بلکہ ایک ہی زمانہ کے مختلف افراد اور ایک ہی شخص کے مختلف

اوقات واحوال میں بھی عقلی تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے۔ ایسی عقل کو معیار تسلیم کرنے میں انسانی زندگی اور مذہبی صداقتوں کا جو بھی حشر ہو جائے وہ کم ہے۔

جن امور میں عقل کو دخل دینے کا بجا طور پر حق حاصل ہو ان میں اس کی مداخلت کا یہ عالم ہے کہ بدیہیات ومشاہدات تک کی جڑیں اکھاڑ پھینکی ہیں۔ ذیل میں چند "نمونے" ذکر کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ مذہب کے بنیادی امور کو اس کی دسترس سے ماوری رکھنے میں کس قدر حکمت ودور اندیشی کارفرما ہے۔؟

استبعاد زینو فلسفی (۱) حرکت کس قدر بدیہی اور مشاہدہ میں آنے والی ہے۔ اس وقت جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ بھی قلم کی حرکت کے بغیر ناممکن ہے لیکن قدیم فلسفی "زینو" (پیدائش قبل مسیح) کی عقل کہتی ہے کہ یہ محض فریب اور دھوکا ہے حرکت ناموجود بلکہ ناممکن الوجود ہے[1]

چنانچہ وہ کہتا ہے :-

"حرکت کا تصور ناممکن ہے کیونکہ حرکت کے نقطۂ آغاز سے اس کے نقطۂ انجام یا نقطۂ سکون تک جو خط ہے وہ نقطوں سے بنا ہوا ہے اور چونکہ نقطہ امتداد نہیں رکھتا اس لئے اس خط میں نقطے لامحدود تعداد میں ہیں۔ اس لئے ہر فاصلہ خواہ وہ چھوٹے سے چھوٹا ہو لامحدود ہے اور نقطۂ سکون تک کہیں رسائی نہیں ہو سکتی۔

تیز رو ایکلیز (Achilles) (یونان کا ایک مشہور تیز رفتار بہادر) اور زیادہ قرین قیاس "خرگوش"[2] کچھوے سے خواہ وہ کتنا ہی قریب ہو اس کچھوے کو کبھی نہیں پکڑ سکتا کیونکہ اس کو پکڑنے کے لئے پہلے اسے آدھا فاصلہ طے کرنا پڑے گا خواہ وہ کتنا ہی تھوڑا ہو پھر اس آدھے کا آدھا پھر اس آدھے کا آدھا اور یہ سلسلہ غیر متناہی ہے۔ خط کا غیر متناہی طور پر قابل تسلیم ہونا ایسی مشکل ہے جس پر وہ غالب نہیں آسکتا۔

---

[1] مذہب وعقلیات صفحہ ۳۱ [2] مقدمہ فلسفۂ حاضرہ صفحہ ۸۰

تم سمجھتے ہو کہ "تیر" فضا میں سے گذرتا ہے لیکن منزل مقصود پر پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ نقاطِ فضا کے ایک سلسلہ کو طے کرے۔ لہذا یہ یکے بعد دیگرے ان تمام نقطوں پر جاگزیں ہوگا لیکن کسی ایک خاص لمحے میں فضا کے ایک نقطے پر ہونا سکون کا مرادف ہے اس لئے تیر ہر لمحے میں ساکن ہے اور اُس کی حرکت محض نظر کا دھوکا ہے۔

مزید براں اگر حرکت واقع بھی ہو تو یہ مکان یا فضا میں واقع ہو سکتی ہے۔ اب فضا، اگر کوئی حقیقی چیز ہے تو کسی فضا میں اس کا وجود ہے۔ یہ فضا پھر کسی فضا ہی میں موجود ہو سکتی ہے اور یہ سلسلہ لاتناہی ہے۔

تو معلوم ہوا کہ حرکت ہر زاویۂ نگاہ سے ناممکن ہے اور اس کو حقیقی کہنا بالکل لغویات ہے[۱] فلسفہ میں یہ سب استبعاد "زینو" کے نام سے مشہور ہیں[۲]

ظاہر ہے کہ "زینو" کی عقل کا یہ استدلال کس قدر عجیب و غریب ہے۔ اس کے باوجود نہ اس کو کوئی خاموش کر سکا اور نہ ہی استدلال میں اس کی زبان یا قلم کو جو حرکت ہو رہی تھی اس کو کوئی "روک" لگا سکا۔

بارکلے کا فلسفہ (۲) اشیاء کے خارجی وجود میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ انسان۔ حیوان۔ آفتاب و ماہتاب وغیرہ سبھی کا وجود مشاہدہ میں آتا ہے لیکن بارکلے BERKELEY (پیدائش ۱۶۸۵ء وفات ۱۷۵۳ء) فلسفی کی عقل کہتی ہے کہ یہ سب موجودات ذہنی تصورات ہیں اور ذہن سے باہر کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔

چنانچہ وہ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں کہتا ہے:۔

"وہ خارجی اشیاء جو ہمارے تصورات کی اصل ہیں یا قابل ادراک ہیں یا ناقابلِ ادراک۔ اگر وہ قابل ادراک ہیں تو وہ "تصورات" ہیں۔ اس حالت میں مفروضہ اشیاء خارجی اور ان کے تصورات میں کوئی فرق نہ ہوگا اور ہماری بات صحیح ثابت ہو جائیگی

---

[۱] تاریخ فلسفہ صفحہ ۲۰ [۲] مقدمہ فلسفۂ حاضرہ صفحہ ۵

اور اگر یہ مفروضہ اشیاء خارجی قابلِ ادراک نہیں ہیں تو میں پوچھوں گا کہ کیا اس بات کے کچھ معنی ہو سکیں گے کہ رنگ ایک ایسی شے کی طرح ہے جو غیر مرئی ہے۔ نیز سختی و نرمی کا احساس ایک ایسی شے کی طرح ہے جو قابلِ لمس (چھونے) ہے۔ لہذا اشیاء اور اُن کے تصوّرات میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔ محسوس اور تصوّر ہم معنی لفظ ہیں.....

..... ادراک تصورات میں نفس اشیاء کو پیدا کرتا ہے اس لئے ادراک اور تخلیق کے اعمال ایک دوسرے سے مختلف نہیں اور تصوّرات ہی اشیاء ہیں.....

..... خالق فطرت جن تصورات کا نقش ہمارے حواس پر ڈالتا ہے ان کو اشیاء حقیقی کہتے ہیں اور جو تصوّرات تخیل میں پیدا ہوتے ہیں ان میں باقاعدگی وضاحت اور استقلال کم ہوتا ہے اسی لئے ان کو اشیاء کی شبیہیں یا تصورات کہنا نہایت موزوں ہے۔ احساس کے تصورات دماغ کے پیدا کئے ہوئے تصوّرات سے زیادہ قوی مربوط اور مرتب ہوتے ہیں مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ ان کا وجود ذہن سے خارج ہے۔ مادے کا وجود ایک دھوکا ہے۔ تصوّرات کے تواتر سے علیحدہ "وقت" کوئی چیز نہیں۔ اور نفس سے علیحدہ "مکان" کا کوئی وجود نہیں صرف نفوس موجود ہیں اور ان کو تصوّرات کا ادراک یا بذاتِ خود ہوتا ہے یا اس قادرِ مطلق روح کے عمل سے جن پر انکا انحصار ہے"

"بارکلے" نے یہ نظریہ نہایت پر زور دلائل سے ثابت کیا ہے اس کی اصل چاشنی سے واقفیت بالتفصیل مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتی ہے [1]

اور اس پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں مثلاً جن چیزوں کا خارج میں مشاہدہ کیا جاتا ہے سورج چاند ستارے دریا پہاڑ وغیرہ کیا یہ سب محض فریب اور دھوکا ہیں؟ یا اس اصول کے مطابق کیا ہم تصورات ہی کھاتے پیتے اور تصوّرات ہی پہنتے اوڑھتے ہیں؟ وغیرہ ان سب کے جوابات اس انداز میں ہیں کہ جنھیں دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فلسفہ مصنفہ الفرڈ ویبر

لیکن پھر بھی سوالات کا حق محفوظ ہے اور بہت سے ایسے ہیں کہ جن کے جواب سے غالباً "بارکلے" عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ مثلاً اگر یہ بات صحیح ہے کہ غیر مدرک اشیاء کا کوئی وجود نہیں ہے تو گہری نیند کی حالت میں روح کہاں چلی جاتی ہے؟ یا اگر ذہن سے باہر کسی شے کا وجود نہیں اور شے دیکھنے ہی سے موجود ہے تو سو جانے کے بعد کون اس کا درک کرتا ہے جبکہ شے موجود رہتی ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ "بارکلے" اشیاء کے خارج از ذہن ہونے کا قائل نہیں ہے مگر نفوس کی کثرت کو وہ مانتا ہے لیکن یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس کے علاوہ دیگر نفوس بھی موجود ہیں؟ نیز کون سے نفوس ہیں جو شے کا ادراک کرتے اور اس کو معدوم ہونے سے بچاتے ہیں؟ وغیرہ

ہیگل کا فلسفہ (۳) منطق و فلسفہ کی کتابوں میں برابر یہ تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ "تناقض محال ہے" نہ کبھی اس کے خلاف کا خیال گذرتا تھا اور نہ ہی عقل باور کرنے کے لئے تیار تھی لیکن جدید دور کے مشہور فلسفی "ہیگل (پیدائش ۱۷۷۰ء وفات ۱۸۳۱ء) HEGEL" کی عقل نے نہایت زور انداز میں ثابت کر دیا کہ تناقض نہ صرف ممکن بلکہ بکثرت پایا جاتا ہے حتیٰ کہ کائنات کا وجود محض تناقض پر مبنی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

"ہستی کی ان مختلف صورتوں کی کیا توجیہہ ہو سکتی ہے؟ ہستی خالص جس کے سوا کچھ نہیں کوئی اور شے کیسے بن جاتی ہے؟ کس مبداء یا قوت باطنی کی وجہ سے اس میں تبدیلی صورت واقع ہو جاتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہستی میں جو تناقض پایا جاتا ہے وہی اس کا مبداء یا قوت ہے۔ تصور ہستی میں سب سے زیادہ کلیت پائی جاتی ہے اس لئے یہ تصور سب سے زیادہ بے مایہ ہے سفید ہونا سیاہ ہونا متمدن ہونا اچھا ہونا کچھ نہ کچھ ہونا ہے لیکن بلا تعین ہستی مرادف نیستی ہے لہذا بسیط اور خالص ہستی عدم کے برابر ہے۔ ہستی اپنا آپ بھی ہے اور اپنا متضاد بھی۔ اگر یہ صرف اپنا آپ ہی ہوتی تو بالکل غیر متحرک اور لاحاصل ہوتی اور اگر یہ لاشی محض ہوتی تو صفر کے برابر اور بالکل بے قوت و بے ثمر ہوتی لیکن چونکہ یہ وجود و عدم دونوں ہے اس لئے یہ کوئی شے مختلف شے یا ہر شے بن جاتی ہے۔ ہستی کا داخلی تناقض حدوث یا ارتقاء

کے تصور سے رفع ہوجاتا ہے، حدوث میں ہستی بھی ہے اور نیستی بھی۔ (بعد میں ہونے والی بات) ہستی اور نیستی جن کے تضاد سے یہ پیدا ہوتا ہے دونوں اس کے اندر متفق طور پر موجود ہوتی ہیں۔ پھر ایک نیا تضاد جو ایک نئی ترکیب سے رفع ہوتا ہے یہ عمل جاری رہتا ہے یہاں تک ہم ایک تصور مطلق تک پہنچ جاتے ہیں۔ لہٰذا ہیگل کی منطق میں یہی چیز مبدء و محرک ہے کہ تناقض کے اندر وحدت پیدا ہوتی ہے پھر ایک نئی صورت میں تناقض پیدا ہوتا ہے تاکہ پھر ناپید ہوا اور پھر پیدا ہو یہاں تک کہ بالآخر وحدت انتہائی میں بالکل رفع ہوجائے۔"

"ہیگل" بنیادی حیثیت سے جس نقطۂ نظر کا حامل ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں البتہ جس انداز سے وہ معارضات کا پردہ اٹھاکر اپنے مسلک کو واضح کرتا ہے اس کی ادنیٰ جھلک یہ ہے :۔

"تناقض صرف فکر ہی میں نہیں بلکہ اشیاء کے اندر موجود ہے ہستی خود تناقض ہے جب موجودیتی اور ثنویتی نظامات کے مطابق ہم فکر کو اس کے مکفور سے علیحدہ کرکے ہر ایک کو ایک مستقل ہستی خیال کرتے ہیں تو متناقضاتِ فکر ہمت شکنی اور تشکیک کا سرچشمہ بن جاتے ہیں لیکن جب فطرت کو فکر کا ارتقاء ذات کہیں اور فکر کو فطرت کا شعورِ ذات۔ جب ہم یہ سمجھ لیں کہ کائنات فکر کی پیکر پذیری ہے اور اس لئے اس میں فکر کے سوا کچھ نہیں تو فلسفی جس تناقض میں مبتلا ہوتا ہے وہ اشیاء کو سمجھنے میں مزاحم نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس راز سے آگاہ ہوجاتا ہے کہ تناقض عین اشیاء ہے اور فکر کا تناقض اشیاء کے تناقض کا آئینہ ہے۔"[1]

ان تفصیلات سے بخوبی واضح ہے کہ عقلی معیار نہایت ناپائدار اور متناقض ہے نیز جو شے اس معیار پر پوری اترنے کی مدعی ہو وہ کوئی پائدار اور ثابت حقیقت نہیں قرار پاسکتی ہے اس بنا پر مذہب کی اٹل حقیقت کو جانچنے کے لئے نہ عقلی معیار درست ہوسکتا ہے اور نہ اس معیار کے بعد کوئی اس کی پائدار حقیقت برقرار

---

[1] تاریخ فلسفہ ص۴۲۲

رہ سکتی ہے۔

عقلی امور میں عقل کی زود اثری اور تلون مزاجی محمود ہے

ان تفصیلات سے یہ مغالطہ نہ ہونا چاہیئے کہ عقل کا تزلزل و تناقض مذموم ہے بلکہ جن امور میں اس کو دخیل بنایا گیا ہے ان میں اس کی یہ حیثیت ہی قابل صد ستائش ہے اگر اس انداز میں وہ بروئے کار نہ آتی رہے تو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔

کون انکار کر سکتا ہے کہ کائنات کی ہست و بود کی نیرنگیاں و حسن افروزیاں اسی عقلی تنوع و تلوّن کی بدولت قائم ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی یہ اپنی وسیع چادر سمیٹ لے تو کارخانۂ ہستی کی ترقی پذیر حیثیت ختم ہو جائے اور یہ دنیا جانوروں کا "بھٹ" بن کر رہ جائے۔ یہی قدرت کی کارفرمائیوں اور جلوہ گریوں کا مشاہدہ کر کے ایک طرف تحقیقات کے لئے بے شمار دفینے برآمد کرتی ہے اور دوسری طرف نظر و اعتبار کے مختلف پہلو عطا کرتی ہے جس کی بنا پر یہ کارخانہ روز افزوں ترقی پذیر ہے۔

مذہب اور زندگی میں بھی عقل کی کافی خدمات ہیں

مذہب اور زندگی کے معاملات میں بھی اس کی خدمات کچھ کم نہیں ہیں اس نے کارسازی کو دیکھ کر کارساز کا پتہ لگایا ہے۔ عمل کو دیکھ کر عامل کی تحقیق کی ہے۔ عمارت کی موجودگی سے "معمار" پر استدلال کیا ہے۔ صناعی کے وجود سے صانع کی جستجو کی ہے اس طرح مظاہر قدرت کا مشاہدہ کر کے قادر مطلق اور عقل و ارادہ رکھنے والی مافوق الفطرت ہستی (خدا) کا سراغ لگانے میں بڑی حد تک کوششیں کی ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کا خدا سمندر پار سے علت و معلول کے مراحل طے کر کے "علت العلل" کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔

اس ایجابی پہلو کے علاوہ اس کی سلبی خدمات بھی "آب زر" سے لکھنے کے قابل ہیں۔ چنانچہ عقل و ارادہ رکھنے والی ہستی کی کارفرمائیوں اور کارگذاریوں کو دیکھ کر اس نے اندھی بہری فطرت۔ بے جان مادہ اور بے حس الیکٹرون کو فاعل و خود مختار تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہونچی ہے کہ عقل کی قلت و سطحیت انسان کو بے دینی کی طرف مائل کرتی ہے اور اس کی وسعت و گہرائی مذہب سے قریب کر دیتی ہے۔ جیسا کہ مشہور فلسفی "بیکن" (BACON) (پیدائش ۱۵۶۱ء وفات ۱۶۲۶ء) کہتا ہے۔

"بیکن" فلسفی کا اظہار حقیقت | "اگرچہ تھوڑی تحقیق سے انسان "دہریہ" ہو جاتا ہے لیکن گہری تحقیق پھر اقرار خدا کی طرف واپس لے آتی ہے۔ دہریت سے انسان ذلیل ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی روحانی فطرت کو امداد اور سہارے کی ضرورت ہے تاکہ اس کی جسمانی فطرت اس کو قعر مذلت میں نہ جا گرائے۔ انسان ایک اعلیٰ ہستی کے تعلق سے اسی طرح شریف ہو جاتا ہے جس طرح کتا انسان کے تعلق سے۔ لیکن توہم پرستی دہریت سے بدتر ہے۔ خدا کی نسبت بے اعتقادی ایسے اعتقاد کی نسبت بہتر ہے جو خدا کو ذلیل کرے اور اُس کے شایان شان نہ ہو پہلی حالت تو محض بے اعتقادی ہے اور دوسری خدا کی تذلیل و تحقیر۔ توہم پرستی بے اعتقادی کی نسبت زیادہ تر بداخلاقیاں پیدا کرتی ہے۔ توہم پرستی مملکت کے لئے بھی خطرناک ہے۔ کیونکہ اس سے ایسی قوتیں پیدا ہو سکتی ہیں جو مملکت کی قوت سے بڑھ کر ہوں اس حالت میں عقلمند مجبور ہوتے ہیں کہ احمقوں کی پیروی کریں [1]

ایک اور موقع پر نہایت نفیس بات کہتا ہے جو مذکورہ مدعا کے بڑی حد تک موافق ہے۔

"ہرگز کبھی فلسفہ اور مذہب میں خلط مبحث نہیں کرنا چاہیئے اس سے فلسفہ وہم یافتہ ہو جاتا ہے اور مذہب ملحدانہ۔ ان دونوں کے مآخذ جدا جدا ہیں۔ فلسفہ ادراک حسی سے شروع ہوتا ہے اور مذہب کی بنا وحی و الہام ہے۔ سائنس میں نفس انسانی حواس کے زیر اثر ہوتا ہے اور ایمان میں ایک دوسری ذات برتر (خدا) کے زیر اثر۔ اسی لئے ایمان سائنس سے اشرف ہے اور کوئی سر الٰہی جتنا برتر از گمان و یقین ہو اتنا ہی اس کا ماننا خدا کے سامنے اظہار نیاز ہے اور اتنا ہی زیادہ شاندار ایمان کا غلبہ۔ جب ہم ایک مرتبہ دین کے اصولوں کو تسلیم کر لیں تو ان سے ہم اسی طرح منطقی نتائج اخذ کرتے ہیں جس طرح ہم فلسفہ میں اصول اولیہ سے اخذ کرتے ہیں لیکن ان دونوں میں بڑا اہم فرق یہ ہے کہ فلسفہ میں دیگر تمام قضایا کی طرح اصولوں کا بھی استقرار سے گہرا تنقیدی امتحان کیا جاتا ہے لیکن مذہب میں ان کی الٰہی سند ہونے کی وجہ سے اصول اولیہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے جس طرح سطرنج کے اساسی قوانین معرض بحث میں نہیں آ سکتے ہیں" [2]

---

[1] تاریخ فلسفہ جدید جلد اوّل ص ۲۳۵

[2] " " " ص ۲۳۴

فطری و آزاد خیالی دونوں مذہب زندگی کی کشتی ساحل مراد پر نہ پہنچا سکے تھے

گذشتہ توضیحی مباحث سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ فطری و آزاد خیالی دونوں مذہب اس پوزیشن میں نہ تھے کہ اُن کے ذریعہ جذبات و مرغوبات کے سمندر میں موجوں کے ساتھ کھیلنے والی زندگی کی کشتی ساحل مراد پر پہونچ سکتی۔

دور جدید کے نازک و پرخطر موڑ میں فطرت سے بڑی توقعات وابستہ تھیں اور یہ واقعہ ہے کہ اگر فطرت کے صحیح انداز میں نوک پلک درست کئے جاتے تو بجا طور پر اسکو رہنمائی کا حق حاصل تھا لیکن اس مایوسی اور بے بسی کا کیا علاج کہ فطرت کے ابہام (مجہولیت) کو وہ مفکرین بھی دور نہ کر سکے جنھوں نے نظام فطرت پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ چنانچہ ہولباخ "HOLBACH" اور اسپینوزا "SPINOZA" وغیرہ ایک طرف تو فطرت کو قائم بالذات، اپنی آپ علت اور آپ اپنا جوہر ازلی کہتے ہیں اور دوسری طرف اس بات کے قائل ہیں کہ ہمیں صرف ان علتوں کا علم ہوتا ہے جو تجربہ میں عمل کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں علل اولیہ کا علم نہیں ہوتا ہے۔ اس قول کی بنا پر فطرت کا تصور تجربہ پر قائم قرار پاتا ہے۔ جبکہ پہلی صورت میں اس کو محض ایک تعمیر فکر قرار دیا جاتا ہے۔

اس ابہام کے علاوہ بھی بہت سے سوالات ہیں جن سے فطرت کے مبلغین عہدہ برا نہ ہو سکتے تھے۔ مثلاً فطرت کی صحت و صداقت کا معیار کیا ہے؟ تجربہ ہم کو کہاں تک لے جا سکتا ہے؟ تعمیراتِ فکر کا جواز کیا ہے؟ وغیرہ

اسی طرح زندگی کے بحران و تلاطم کو دور کرنے کے لئے عقل کی رہنمائی کو کافی قرار دیا گیا تھا۔ لیکن زیادہ دن نہ گذرنے پائے تھے کہ جذبات و مرغوبات کا طوفان اس شدید انداز میں اٹھا کہ عقل خود اس کی لپیٹ میں آ گئی پھر وہ رہنمائی تو کیا کرتی اس کو اپنی "گرہ" کی عقل نہ رہ گئی۔

ظاہر ہے کہ زندگی کے جن "تاروں" کا تعلق قلب سے ہے ان میں عقل کی رہنمائی بے سود تھی، ایسے ہی زندگی کے جن مسائل کا تعلق عقل و قلب دونوں کے "آمیزہ" سے ہے اُن میں تنہا عقل بیکار تھی۔ اس دور کے اکثر مفکرین نے نہ قلب کو علم و ادراک کا ذریعہ تسلیم کیا تھا اور نہ ہی زندگی کے مسائل حل کرنے میں اس کو کوئی خاص مقام دینے کے لئے تیار تھے۔ لیکن ان کی محرومی و ناکامی خود شاہد ہے کہ عقل کے علاوہ

بھی کوئی "شے" ہے کہ جس کا زندگی کے مسائل سے گہرا تعلق ہے اور جس کی طرف توجہ کئے بغیر زندگی کے "خالی خانہ" پُر ہونے کی کوئی شکل نہیں ہے۔

غرض ایک طرف عقل و فطرت کی ناقص رہنمائی تھی اور دوسری طرف جذبات و مرغوبات کا موجیں مارتا ہوا سمندر جس میں زندگی کا "جہاز" مایوسانہ انداز میں چل رہا تھا۔

ردعمل کی شکل میں تہذیب جدید کا جائزہ

اس صورت حال کا نتیجہ "ردعمل" کی شکل میں ظاہر ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ تنگ آکر یہ آوازیں بلند ہونے لگیں کہ تہذیب جدید نے نہایت بے ہنگم طریقے سے جلدی جلدی ہر طرف ترقی کر لی ہے اور یہ تحریک ایک غلط راستہ پر پڑ گئی ہے"۔

اس احساس و تاثر کے بعد اصلاح کی فکر ہوئی اور فرانس کی اصلاعی اکاڈمی (انجمن ویزان) نے ارباب علم و بصیرت کو تحقیق و ریسرچ کی دعوت دی کہ آیا علوم و فنون کی ترقی سے اخلاق کی صفائی ہوئی ہے یا اس میں کثافت آگئی ہے؟ اس موضوع پر بہترین مضمون کے لئے "اکاڈمی" نے انعام بھی مقرر کیا تھا۔

اصلاحات کے نقوش و حدود پر تبصرہ

قومی و جماعتی زندگی کے رمز شناس جانتے ہیں کہ اس قسم کے مقالوں اور بیانات سے نفس کی تسکین تو ہو جاتی ہے لیکن مرض کا اصل علاج نہیں ہوتا ہے۔

اُن کے ذریعہ مرض کا احساس یقیناً کم ہو جاتا ہے اور اگر بروقت صحیح علاج میسر آجائے تو مرض میں بھی افاقہ ہو جاتا ہے۔ لیکن دور جدید میں جس بحرانی زندگی کا تذکرہ ہے اس میں اصلاح کے لئے مضبوط قیادت اور منظم پروگرام نہ ہونے کی وجہ سے اصل علاج کی طرف زیادہ توجہ نہ ہو سکی تھی صرف ان دواؤں اور غذاؤں سے کام لینے کی کوشش ہوتی تھی جو انتہائی کرب و الم میں سکون قلب کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

بلاشبہ "ردعمل" کے طور پر اصلاح کے کچھ نقوش و حدود ابھرے تھے۔ جن سے معاشرتی زندگی میں بعض مفید اور انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ لیکن چونکہ ان کی بنیادیں مستحکم اور مضبوط نہ تھیں۔ نیز "جواہر" کی پرورش اور جراثیم کی خاتمہ کے لئے کوئی منظم پروگرام نہ تھا اس لئے ان سے زیادہ ان کا کام نہ چل سکا اور تھوڑے ہی دنوں بعد وہ طوفان زیادہ شان و شوکت کے ساتھ عود کر آیا۔

اس دور میں قائدین کی ضرورت تھی اور "روسو" و "کانٹ" مفکر تھے

ذیل میں دو اہم شخصیتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کے نظریات و مقالات نے زندگی میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی تھی وہ ہیں "جین جیک روسو (پیدائش ۱۷۱۲ء وفات ۱۷۷۸ء) "JEAN JACQUES ROUSSEAU" اور ایمینول کانٹ IMMANUEL KANT

پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ یہ دونوں حضرات مفکر تھے قائد نہ تھے۔ قائدین میں جن خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے وہ بڑی حد تک ان میں مفقود تھیں البتہ مفکرین کی خصوصیات ان میں موجود تھیں (قائدین کی خصوصیات نیز قائدین و مفکرین میں امتیاز کو سمجھنے کے لئے راقم کی کتاب "عروج و زوال کا الٰہی نظام" مطالعہ کرنا چاہیئے)

اجتماعی زندگی کے ماہرین غالباً اس حقیقت سے انکار نہ کر سکیں کہ جب زندگی کا جہاز طوفان میں پھنسا ہو اور کوشش کے باوجود "کپتان" بے بس ہو چکا ہو تو قائدین ہی سے جہاز کو ساحل مراد پر پہونچانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ یہ حضرات روحوں اور دلوں کی بستیاں الٹ کر ان میں ایمان و اعتقاد کی قوت بھرتے ہیں اور ذہنی و اخلاقی استعداد کی تربیت کر کے زندگی کو کھینچنے کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ مفکرین چونکہ صرف خیالات و افکار پیدا کر کے زیادہ سے زیادہ سے انھیں دوسروں تک پہونچانے پر اکتفا کرتے ہیں اس لئے قومی و جماعتی زندگی کے نشیب و فراز اور پُرخطر گھاٹیوں کو عبور کرنے میں انھیں زیادہ کامیابی نہیں حاصل ہوتی ہے۔

پھر صحیح قیادت کے لئے جس قسم کی عالی ظرفی، بلند ہمتی اور کردار کی پختگی وغیرہ درکار ہے ان مفکرین میں بڑی حد تک وہ بھی مفقود ہوتی ہے

روسو کی عظیم شخصیت

"روسو" پہلا اور عظیم شخص ہے جس نے اس بحرانی دور میں ایک گہری اساس کو نمایاں کر کے تہذیب کے مسئلہ کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے زندگی کے دھارے کے ساتھ بہنا پسند نہیں کیا بلکہ زمانہ کی نبض کو پہچان کر دھارے کے خلاف تیرنے کو ترجیح دی۔ اس کی عظمت کو سمجھنے کے لئے اس دور کے حالات کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے۔

عظمت کو سمجھنے کے لئے حالات کا سرسری جائزہ

مذہب و اخلاق کی حالت یہ تھی:-

" آخر ش اٹھارھویں صدی عیسوی کی گری ہوئی اخلاقی حالت نے تمام ممالک کی تمام جماعتوں کے افراد کی اس سرگرمی کو زائل کر دیا تھا جو کہ انسانی ہمدردی میں کی جاتی ہے۔ براعظم کے دونوں پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک ممالک میں عیسائی مذہب کی طرف سے بداعتقادی عام ہوگئی تھی۔ کیتھولک ممالک کے بیشتر پادری اپنی اوباشی کی وجہ سے بدنام تھے اور اُن کی اس مذہب کے اصولوں سے ظاہرا نفرت ان کی بدکرداری کے برابر تھی جس کی وہ تعلیم دیتے تھے۔ جرمنی کے پروٹسٹنٹ پادری بھی اپنی بے دینی میں ایسے ہی آزاد تھے ...... پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک ممالک میں عیسائیت اخلاق کے دلپذیر حالات میں تبدیل ہو گئی تھی ...... ان موہوم اور بے اصول اخلاق کی وجہ سے کئی مخفی انجمنیں جیسے کہ " روزیٹی " اور الیومینٹی جنڈدوں کے حلقے وجود میں آگئے تھے جنھوں نے مذہب کی جگہ مشن اور علامتی رسمیں رکھی تھیں[۵۱]

ایک طرف یہ حالت تھی اور دوسری طرف علوم و فنون کی نئی روشنی سے دنیا کی آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں۔ نشاۃ ثانیہ کے ادبی کارنامہ۔ فنون لطیفہ اور سائنس و فطرت کی معرکہ آرا ایجادوں نے لوگوں کو مسحور کر رکھا تھا اور ایک انسائیکلوپیڈیا (جس کا ایک شریک روسو بھی تھا) تیار ہو رہی تھی کہ جس کا اہم مقصد معمولی پڑھے لکھے لوگوں کو بھی نئی علمی و ادبی تحریکات سے روشناس کرانا تھا۔

دی انسائیکلوپیڈیا " اٹھارھویں صدی عیسوی میں فرانس میں تیار ہوئی تھی جس میں لاک JOHN LOCKE (پیدائش ۱۶۳۲ء وفات ۱۷۰۴ء) کے فلسفہ اور دیگر جدید علوم کی مدد سے پرانے علمی اور مذہبی خیالات پر سخت تنقید کی گئی ہے ' روسو نے مختلف مضامین موسیقی پر اور ایک معاشیات پر لکھا تھا[۵۲]

علوم و فنون کے افادی اثرات و نتائج پر روسو کی تنقید

ظاہر ہے کہ ان حالات میں موجودہ علوم و فنون کی شان میں گستاخی کرنا یا اُن کی افادیت کو مجروح قرار دینا معمولی ہمت کا کام نہ تھا۔

---

۵۱ اخلاق یورپ ص۱۱ از ایچ مور اسٹیفنس ۵۲ مقدمہ معاہدہ عمرانی

ادھر فرانس کی مذکورہ انجمن "ریزون" نے جس موضوع پر مقالہ لکھنے کی ارباب علم و بصیرت کو دعوت دی تھی اس کا تعلق علوم و فنون کے افادی اثرات و نتائج پر تنقید ہی سے تھا۔

"روسو" وہ باہمت شخص ہی جس نے فلسفۂ تنویر اور حالات موجودہ کا تنقیدی جائزہ لیا اور مذکورہ موضوع پر مقالہ پیش کر کے انعام اور شہرت حاصل کی۔

"روسو" کی خیالی و فکری دنیا میں تقریباً ہر جگہ انسانی فطرت اور تہذیب و تمدن کا تضاد نظر آتا ہے۔ اس کے نزدیک حالت فطرت ایک خالص جبلّی حالت ہے جس کو تہذیب و تمدن پر اس لئے تفوق حاصل ہے کہ فطری حالت میں انسان کی ضرورت اور اُس کو پُورا کرنے کی قابلیت میں توازن ہوتا ہے۔ فطرت سے مراد وہ سادگی۔ مساوات۔ بھلائی اور آزادی لیتا ہے اور تہذیب و تمدن کے لوازم تعیش بداخلاقی، غلامی اور ایمان و یقین کی کمزوری ہیں۔

باقی

الخیر الکثیر (عربی)

حجۃ الاسلام مولانا شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ العزیز کی نہایت بلند پایہ کتاب "الخیر الکثیر" جو مخزن ہے اسرار و معارف کا، علم حقائق کا۔ اور بات بالکل ظاہر ہے کہ جب تک شریعت کے غوامض و حِکَم سے پُوری واقفیت نہ ہو اس کے بغیر ایمان محض ایمان بالغیب و عمل صرف تعمیل حکم کے درجوں تک محدود رہتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے کتاب و سنت سے خود ایک فلسفہ تیار کیا ہے جسے ہم اسلامی فلسفہ کہیں تو مناسب ہے۔ اس کتاب میں حضرت شاہ صاحب نے یہی فلسفہ پیش فرمایا ہے۔ الخیر الکثیر کے متعلق حضرت العلامۃ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:۔

"ان درجتہ فی کشف الحقائق ارفع من حجۃ اللہ البالغہ وغیرھا من تالیفات الشاہ ولی اللہؒ" آپ کے اس قول سے کتاب کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

تقطیع خورد۔ قیمت عہ۔ مکتبہ برہان اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی ۶

۳۲